سید ارتضٰی حسن کاظمی* ڈاکٹر صوفیہ یوسف**

فیض کی غزل : ایک گلدستۂ نورنگ

Abstract*: 'Ghazal" is the pride of Urdu poetry and Ghazals composed by Faiz are the nobility of the Urdu Ghazal. Categorizing it as the crux of classical Ghazal will be unjustified as Faiz has adorned it with real life and realism in an unmatched manner. Ghazal composed by Faiz abounds with healthy trends and still touches the deep cords of heart although it is stimulated through external factors .The basic reasons for its fame is that Faiz has created the ripples among the society in a very polite and humble manner. Moreover, amalgam-self of emblazonment and heartwarming has given such a beautiful and heart touching quality to his Ghazal that it has engrossed and enslaved the middle class with its uniqueness of creating serenity in togetherness as well as in estrangement.*

یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ تند و تیز تنقید کے باوجود بھی غزل ہر دور میں مقبول صنفِ سخن رہی ہے۔ اس میں یقیناً کوئی ایسا جادو تو ہو گا کہ جس کے باعث غزل کو ہر دور میں قبولیتِ عام نصیب ہوئی ہے۔ یہ سحر کاری، یہ فسوں آخر کیا ہے؟

غزل کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس کا دامن موضوع کے اعتبار سے بے حد وسیع ہے۔ غزل موضوع کے اعتبار سے تو ہمہ گیر ہے مگر غزل میں دیگر کون سی ایسی خوبیاں ہیں جن کے باعث اِس کی ہر دل عزیزی میں فرق نہیں آیا۔ معروف نقاد معین الدین عقیل اس سلسلے میں اپنی تصنیف پاکستانی غزل میں فرماتے ہیں:

> ''اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے اس میں ایسی فطری لچک موجود ہے کہ یہ اپنے اصل مزاج اور بنیادی ہیت و ترکیب رکھتے ہوئے ہر دور کے نئے تقاضوں میں نہایت آسانی کے ساتھ ڈھل جاتی ہے اور ہر عہد کے مزاج کی حقیقی ترجمانی کرتی ہے۔''[1]

جب اَدب بیسویں صدی میں داخل ہو رہا تھا تو اس دوران میں دنیا بھر میں نئے تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی رجحانات کا غلبہ زور پکڑ رہا تھا۔ ایک طرف جمہور کی آواز توانا ہو رہی تھی تو دوسری جانب اسے دبانے کی کوششیں نئے نئے روپ بدل کر ظاہر ہو رہی تھیں۔ اس کشمکش سے اُردو شاعری بھی متاثر نظر آئی۔ تخلیق کی دنیا میں ہلچل پیدا ہوئی کیونکہ کارخانۂ فطرت میں جمود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہاں یہ

* پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور
** ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبہ اُردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور

بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبالؔ غزل کے دامن میں گنجائش کے روشن امکانات کا عندیہ بھی دے چکے تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں اَدب نے نئے معیار قائم کیے جو ماضی میں وجود نہیں رکھتے تھے۔ شمیم حنفی نے جدیدیت اور نئی شاعری کے حوالے سے اپنی کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''بیسویں صدی کے مخصوص سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور جذباتی ماحول نے زندگی کی طرف چند تازہ کار زاویۂ ہائے نظر کی ترتیب و ترویج میں حصہ لیا اور تاریخ کے خود کار عمل کے نتیجے میں فکر و فن کے ایسے معیار بھی سامنے آئے جن کی نوعیت اُردو کی عام شعری روایت سے مختلف تھی۔ ''۴

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غزل نے ہر دور کے مزاج کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل اور اس کے بعد نئے ماحول سے مزاج آشنا ہونے اور اس کی ترجمانی کرنے میں غزل پیش پیش رہی۔ اپنی فطری لچک کے باعث غزل کی مقبولیت میں مجموعی طور پر اضافہ ہوا۔ حلقۂ اربابِ ذوق اور چند انفرادی رویوں، کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک نے اس سلسلے میں گراں قدر اضافے کیے۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے فیض احمد فیضؔ کا نام انتہائی معتبر ہے۔ فیضؔ کی غزل پر روشنی ڈالنے سے قبل ماکسزم اور ترقی پسند تحریک سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ اس تحریک کے حوالے سے گزشتہ ساٹھ ستر سال میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تحریروں میں سے بہت سی تحریریں ایک شعوری اور فطری ردِ عمل کا حصہ تھیں مگر اب جب کہ فَضا کافی حد تک بدل گئی چکی ہے، اِن کا جائزہ لینا اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنا ایک نیا تجربہ ہو گا۔

فیضؔ پر کسی بھی قسم کی بحث چھیڑنے سے پہلے یہ سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے کہ مارکسزم کیا ہے۔ عام طور پر اسے پروپیگنڈہ اَدب کہا جاتا ہے یا پھر نعروں کی سطح تک محدود کیا جاتا ہے۔ بعض افراد کے نزدیک یہ چونکا دینے والا اَدب ہے۔ بعض اسے معاشی کیفیات کا عکس بھی کہتے ہیں۔ اکثر کے نزدیک یہ کلاسیکیت یا رومانیت سے خالی ہے۔ بے شمار ناقدین کی نظر میں اِس اَدب میں شاعر کے خواب اور نظریات ان کی اپنی دھرتی سے جنم نہیں لیتے۔ بعض کی رائے میں اس میں فنی محاسن عنقا ہیں۔ کچھ کی نظر میں مقصدیت سے اَدبی حُسن غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ کی دانست میں یہ محض ہنگامی اَدب ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی وقعت کھو بیٹھتا ہے۔ مگر یہ سب باتیں مارکسیت سے عدم واقفیت کی بنا پر کی جاتی ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ مارکسیت بھی اِن تمام باتوں کو غلط تصور کرتی ہے جس سے اِسے عام طور پر وابستہ کیا جاتا ہے۔ آیئے ان سب باتوں کی تہہ تک اُترنے کی کوشش کریں۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے ہاں مارکسی تنقید کا دبستان پنپ نہ سکا۔ ہر نقاد نے اِس حوالے سے اپنی رائے کو مقدم سمجھا۔ ہر چند کہ تنقید کے اُصول بھی وضع کیے گئے مگر خاطر خواہ نتائج بر آمد نہ ہو سکے۔ البتہ اِن میں سے چند ناقدین کی کوششیں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بہت خوبصورت انداز میں اس ساری بحث کو سمیٹا ہے اور ان ناقدین کی کوششوں کو سراہا ہے۔ اس تحریر سے ہمیں اپنی ملک میں مارکسیت کے مختصر ارتقا کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے:

> ''جدید اُردو تنقید میں ایک اور اہم تجربہ مارکسی رجحان کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ در حقیقت یہ سماجی اور عمرانی رجحان ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے اِس کی آبیاری کی ہے۔ اور نئے

افکار نے اس میں نئے نئے گُل بوٹے کھلائے ہیں۔ حالیؔ عمرانی رجحان کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ لیکن اُن کا نقطہ نظر تمام تر اصلاحی تھا۔ دورِ جدید میں اس اصلاحی رجحان نے انقلابی رجحان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اِ س کے زیرِ اثر اَدب کے نئے تصورات کا وجود ممکن ہوا۔ اَب بعض نقادوں نے اِس کو سماجی و تہذیبی زندگی کا عکاس ہی نہیں سمجھا بلکہ زندگی کی طبقاتی آدرش میں اس کو عوام کے مفاد کا علم بردار اور خیر کی قوتوں کا پیامبر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جدلیاتی مادیت کے فلسفے کو سامنے رکھ کر انہوں نے اَدب کی ارتقائی کیفیت کا اندازہ لگایا۔ حالات نے صحیح مارکسی نقاد تو اُردو میں کم پیدا کیے لیکن ایسے نقادوں کو ضرور پیدا کیا جن کی تنقیدیں بڑی حد تک مارکسی اُصولوں کو پیشِ نظر رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔"۳

کارل مارکس (۱۸۱۸۔۱۸۸۳) نے اپنا نظریۂ اَدب کے لیے نہیں بلکہ معاشی و عمرانی اصلاحات کی غرض سے دیا۔ مگر یہ نظریہ مغربی تنقید پر دور رس نتائج کا حامل ٹھہرا۔ کیونکہ ہمارے ہاں تنقید مغرب سے آئی لہٰذا اِس نظریہ کا ہماری تنقید پر اثر انداز ہونا باعثِ حیرت نہیں۔ فرد اور معاشرے کے تعلق کے حوالے سے مارکسزم کا نظریہ بالکل سادہ اور واضح ہے۔ کسی بھی معاشرے میں پیدا ہونے والا کوئی بھی فنکار اسی معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کے نظریات بھی اِ سی کارخانے کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یوں اَدب بھی معاشی نظامِ حیات کے تابع ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کارل مارکس کے اِس نقطہ کی وضاحت یوں کی :

"شاعری بھی انہی قوتوں سے وجود میں آتی ہے جو قوتیں طبقات کو جنم دیتی ہیں، اس لئے اِن قوتوں کو سمجھے بغیر شاعری کا سمجھنا مشکل ہے"۴

مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ:

" مارکس یہ نہیں کہتا کہ معاشی نظام میں انقلاب آنے سے اَدب کی دنیا میں بھی عظیم تصانیف وجود میں آئیں گی کیونکہ یہ حقیقت مارکس کے سامنے تھی کہ قدیم معاشی نظام نے بھی بڑا، آفاقی اور غیر معمولی ادب پیدا کیا۔"۵

اس نظریہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم اُردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارا تمام کلاسیکل اَدب اس کی غمازی کر رہا ہے۔ میر دردؔ اور میرؔ کے کلام کے سب محرکات اُس زمانے میں موجود تھے۔ اِسی طرح اقبالؔ تاریخ کے اُس سنگم پر کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے جہاں معاشرہ کروٹ لینا چاہتا ہے۔ اِس گفتگو کی روشنی میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ خارجی محرکات ہی تخلیقِ ادب کا باعث ہوتے ہیں۔ ان سے کٹ کر جو بھی اَدب تخلیق ہو گا وہ معاشرے پر لادھنے کے مترادف ہو گا۔ یہاں یہ نقطہ بھی انتہائی اہم ہے کہ

معاشرے کی حقیقی تصویر کشی ہی پیشِ نظر ہونی چاہیے بصورتِ دیگر اَدب محض پروپیگنڈے کا روپ دھار لے گا۔ جمیل جالبی کی رائے میں اَدب کا یہ روپ مارکسی نظریات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

''مارکس کا مذاقِ اَدب بہت ستھرا تھا۔ اس نے اَدب کو پروپیگنڈہ بنانے کا کبھی نہیں کہا۔''۶

ترقی پسند اَدب کی روح کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُردو اَدب کی روایت کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ ہمارے کلاسیکل اَدب اور رومانوی اَدب میں فرد اور معاشرے کے تعلق کو جس طور پیش کیا گیا ہے وہ غور طلب ہے۔ ہر چند کہ معاشرہ فرد سے اور فرد معاشرے سے ہے، مگر ان کے باہمی ربط کی جو تصور کھینچی گئی ہے وہ کسی بھی اَدبی تخلیق کے لیے خود ایک سوالیہ نشان ہے۔ کلاسیکل عہد سے لے کر موجودہ دور تک ہمارے تنقیدی رویے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہر بڑے ادیب کے لیے سماج سے ٹکر لینے یا گھٹ گھٹ کر جینے میں فن کی تخلیق اور پرورش کا راز مضمر ہے۔ سماج کو حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھنے کی بجائے نظروں سے گرانے میں ایک اعلیٰ فنکار کی عظمتوں کو ثبات حاصل ہوتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟ یہ بات واضح رہے کہ اُردو شاعری کی روایت صوفیائے کرام کی تعلیمات سے جڑی ہوئی ہے جو زمانے کے گرم و سرد کو جھیلنے میں عمرِ عزیز صرف کر دیتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ خواجہ میر دردؔ کے حوالے سے اپنے مضمون دردؔ کا صوفیانہ لب و لہجہ میں لکھتے ہیں:

''ایک عام عاشق کی طرح ایک صوفی بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اِسی سے ٹکراؤ پیدا کر رہی ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے متصادم ہے مگر محبت کی منزل ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں شدائد کے خلاف شکایت وا کرنا دلیلِ خام کاری ہے۔ اس لیے ایک سچا صوفی ان شکایتوں کو اُبھرنے سے پہلے ہی سینے میں کچل دیتا ہے۔''۷

فرد سے سماج کی دشمنی کا جو مفروضہ تراشہ جاتا ہے اس کی اساس پر تمام عمارت کھڑی کی جاتی ہے اور اس تناظر میں تخلیقی عمل کی تشریحات اور معروضات پیش کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ترقی پسند نقاد ڈاکٹر احتشام حسین فرماتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ افراد کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اعلیٰ درجہ کی تخلیق میں ادیب اور فن کار کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے لیکن جس بات کو نظر انداز کر دینے سے یہ مسئلہ اُلجھن پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے نقاد اور مفکر فرد اور جماعت میں کش مکش کو لازمی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ تحلیلِ نفسی کی عمارت کا بڑا حصہ اسی مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان سماج کے ساتھ مجبوراً تعاون کرتا ہے۔ ورنہ اس کی انفرادیت تو سماج سے بالکل الگ ہی رہنا چاہتی ہے، یہی خیال دوسری اُلجھنوں تک لے جاتا ہے کیوں کہ اس میں ایک طرف تو انسانی فطرت کو بعض حیلتوں کا مجموعہ قرار دے دیا جاتا ہے جو بدل

نہیں سکتیں اور دوسری طرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کسی سماجی نظام میں افراد کو بہ حیثیت فرد کے مسرت حاصل کرنے اور اپنی جائز خواہشات پوری کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، نہ تو انسانی فطرت غیر تغیر پزیر ہے اور نہ سماج فرد کا دشمن ہے۔ اس لیے وہ ادیب جو اپنی انفرادیت کو سماج کے عام مفاد سے الگ لے جا کر اپنی خواہشات اور اپنے افکار کو لوگوں پر لادنا چاہتا ہے وہ گویا تہذیب کی ان اقدار کی مخالفت کرتا ہے جسے انسانوں کی عام جدوجہد نے صدیوں کی صبر آزما گھڑیوں کے بعد جنم دیا ہے اور اسے انسان کے مستقبل پر بھروسہ نہیں ہے بلکہ وہ اس اندھی جہالت کا وکیل ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔"۸

اس ساری تمہید کو بیان کر دینے کے بعد ہم اس سطح پر آچکے ہیں کہ ہم ترقی پسند تحریک کو اس کے مارکسی نظریات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ ترقی پسند تحریک اپنے نقطۂ آغاز سے ہی بے حد مقبول تحریک کے طور پر اُبھری۔ اُردو اَدب کی تاریخ میں سرسید کی تحریک کے بعد کوئی تحریک اس تحریک جتنی موثر ثابت نہ ہوئی۔ برِصغیر پاک وہند میں تعلیم یافتہ طبقے کی شرح کچھ زیادہ نہیں لیکن اسکے باوجود بھی یہ تحریک اس سرزمین کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ کیا پڑھے لکھے کیا اَن پڑھ سب نے اس کا خیر مقدم کیا۔ عوام کی بیداری میں اس کا حصہ اہلِ سیاست سے کسی طور بھی کم نہ تھا۔ یوں ترقی پسند تحریک کے مصنیفین کے قلم نے شب کی سیاہیوں کو مٹانے اور لفظوں کے جل ترنگ بجانے میں سب کو مات دے دی۔

بلاشبہ ترقی پسند تحریک کے لیے نظم کی زمیں انتہائی ساز گار اور زرخیز تھی مگر فیضؔ نے اس تحریک سے وابستگی کے باوجود بھی غزل سے اپنا رشتہ انتہائی مضبوط بنائے رکھا۔ اس کی بے شمار وجوہات تلاش کی جاسکتی ہیں مثلاً یہ کہ غزل ہر دور میں سب سے مقبول صنفِ شاعری رہی تھی۔ دوسرا یہ کہ حالیؔ اور اقبالؔ نے کلاسیکل غزل میں تبدیلی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ فیضؔ کی طبیعت غزل سے فطری میلان رکھتی تھی۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت کی سیاسی صورتِحال اس لحاظ سے ساز گار تھی کہ جب غزل کی ایمائیت سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا تھا۔ آیئے اب ہم فیضؔ کی غزل کا تجزیہ کریں۔

اس میں شک نہیں کہ بطور شاعر فیضؔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے مگر آپ کی یہ صلاحیتں پورے طور پر آپ کی غزل میں جلوہ گر ہوئی ہیں یا نظم میں؟ اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ مگر ضبط کی وہ کیفیت جو فیضؔ کی شخصیت کا خاصہ تھی، اِن کی غزلوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ اپنی ہیئت اور ترکیب کے لحاظ سے غزل نظم کی نسبت فیضؔ کی زیادہ ہم مزاج تھی۔ خطابیہ انداز اور پند ونصیحت جو شاعری کے حُسن کو پامال کر دیتے ہیں، ان کی غزل کا ان سے کوئی علاقہ نہیں:

"کہا جاتا ہے کہ فیضؔ نظم کے شاعر ہیں وہ اپنی تمام تر صلاحیتں نظم میں بہتر طور پر پیش کرتے ہیں اس میں صداقت بھی نظر آتی ہے اس لیے میں نے فیضؔ کی نظموں کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ لگایا ہے کہ

فیضؔ اپنی نظموں میں جذباتی زیادہ ہو جاتے ہیں اور اپنا تمام زور اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ مقصدیت کا پہلو ہر وقت نمایاں رہے یہی وجہ ہے کہ میں تبلیغی عنصر خاصی تعداد میں مل جاتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ بحیثیت شاعر کے فیضؔ اپنی غزلوں کی بدولت زیادہ مقبول ہیں۔ ۹

حسرت کاسگنجوی کی اس رائے کے بعد فیضؔ کی غزل کے حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر وہ کون سی ایسی خوبیاں ہیں جو اُن کی غزل میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں اور وہ کون سی خوبیاں ہیں جو اُنہیں دیگر ترقی پسند شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ غزل کی سب سے بڑی خوبی رمز وایمائیت ہے۔ یعنی بات اس انداز سے کہی جائے کہ اس میں مختلف سطحیں موجود ہوں۔ غزل کے اشعار محض بیان یا statement نہیں ہوا کرتے بلکہ چُھپے ہوئے معانی رکھتے ہیں۔ اس کے دو مصرعوں کے درمیان ایک خلا ہوتا ہے جو قاری اپنے ظرف کے مطابق پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فیضؔ کی غزل میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں قاری کا ذہن مختلف انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

آتے آتے یونہی دم کو رُکی ہو گی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے ۱۰

کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی، اب جام میں کمتر جاتی ہے ۱۱

رمز وایمائیت سے غزل کے شعر میں معنویت کی تکمیل ہوتی ہے اور قاری اور شاعر کے درمیان انفرادی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہم آہنگی ایک سیاق وسباق کی متقاضی ہوتی ہے۔ غزل کے ارتقاء کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

"عام خیال یہ ہے کہ ایرانیوں نے عربوں کے تسلط کو کبھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا مگر کیوں کہ ان کے لیے عام زندگی میں کھلم کھلا بغاوت کو ہوا دینا ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں نے غزل کا سہارا لے کر اپنے ردِ عمل کو پیش کرنے کی کوشش کی اور زہد اور پاکیزگی کے میلان کو نشانہ بنایا۔" ۱۲

ترقی پسند تحریک کے عملاً ناکام ہونے کے بعد فیضؔ کی غزل نے نئی معراج پائی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ اب بات اشاروں اور کنایوں میں کہی جانے لگی، طنز اور نشتریت کارگر ہتھیار ثابت ہونے لگے:

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تیری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سخن سے پہلے
نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے
کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے ۱۳

مگر اہم بات یہ ہے کہ فیضؔ کی غزل نے اُن کی نظم پر نہایت خوشگوار اثرات چھوڑے۔ ان کی غزلوں کا تغزل ان کی نظموں کو بھی اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ ان کے ہم عصر ناصرؔ کاظمی فرماتے ہیں :

''خود فیضؔ نظم لکھتے ہیں لیکن غور سے دیکھیے، ان کی ساری کی ساری شاعری غزل ہے۔ تغزل ہی تغزل تو ہے جس کی وجہ سے فیضؔ شاعر ہے۔ ''۱۴

غزل کا اندازِ بیان دِلوں تک رسائی حاصل کرنے کا وصف رکھتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے غزل متوسط طبقہ کی نمائیندگی کرتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ آخر فیضؔ نے غزل کو کیوں چُنا؟ علاوہ ازیں ہمیں اس سوال کا جواب ترقی پسند ادب کے نقاد سید محمد عقیل رضوی کی تحریر میں بھی ملتا ہے:

''غزل، سچ بات تو یہی ہے کہ متوسط طبقے کے عوام ہی کی گفتگو ہے اور بس۔ صرف زبان کے لئے ہی نہیں بلکہ، اُن حالات کے لئے بھی، جو اِن میں بیان کئے گئے ہیں۔ ''۱۵

فیضؔ نے شاعری کا تخلیقی سفر غزل کے سائے سائے کیا۔ فیضؔ روایت پر اس حد تک کاربند نظر آتے ہیں گویا محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے اُن کے نزدیک روایت کوئی برگد کی چھاؤں ہے جس سے نکل کر تپتی دھوپ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اُردو شاعری کے اس گھنے برگد کی مختلف شاخوں جیسے غالبؔ، میرؔ، میر دردؔ، سوداؔ سے لے کر صوفی تبسم تک وہ ہر ایک کی چھاؤں میں بیٹھے اور ان کی شاعری کے رنگ کو لاشعوری طور پر اختیار کرتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم فیضؔ کی شاعری میں ان شعراء کے کلام کی بازگشت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ بالفظِ دیگر ان کی شاعری کلاسیکل شاعری کا خلاصہ کہی جاسکتی ہے:

''اُن کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام کلاسیکی ادب کا رنگ رچا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی غزل کو اُردو غزل کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ ''۱۶

مثال کے طور پر ان کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں کہ اگر ان پر سے ترقی پسندی کا لیبل اُتار دیا جائے تو ان کی حیثیت محض ایک روایتی غزل کی سی رہ جائے گی:

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غم زدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی جیسے پیغامِ دیدارِ یار آگیا
رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک اُمڈے کہ رنگِ بہار آگیا۱۷

شمس الرحمن فاروقی کے مطابق دیگر شاعرانہ خوبیاں جو فیضؔ کے کلام میں گنوائی جاتی ہیں وہ خود اس بات کی ضامن نہیں کہ اُن کی بنا پر فیضؔ کی شاعری کو بلند مقام عطا ہو سکے۔ اپنے مضمون میں وہ فیضؔ کی شاعری کے اس پہلو پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :

> ''فیضؔ نے جہاں کلاسیکی اُسلوب کو کامیابی سے برتا وہاں کیفیت یا مضمون آفرینی کی کارفرمائی ہے۔ ورنہ سیاسی پہلو یا فلسفیانہ پہلو یا عشقیہ پہلو کسی میں کوئی ایسی خوبی فی نفسہ نہیں جو شاعرانہ خوبی سے ضامن ہو سکے۔''۱۸

فیضؔ روایت میں اس قدر کھو چکے تھے کہ اُن کا کلام شروع سے آخر تک روایت سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ زمانی لحاظ سے کلاسیکل شعراء کے ہم عصر لگتے ہیں۔ اُستاد شعراء کی متعدد بحور، ردیف اور قوافی، لب و لہجہ سمیت فیضؔ کے کلام میں جلوہ گر نظر آتے ہیں :

سینے پہ ہاتھ ہے ، نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں
آشفتہ سر ہیں ، محتسبو منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل وجاں عدو کریں ۱۹
(دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں)
(خواجہ میر دردؔ)

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پزیرائی
جس بار خزاں آئی سمجھے کہ بہار آئی
اُمیدِ تلتف میں دونوں رہے رنجیدہ
تُو اور تری محفل، میں اور میری تنہائی۲۰
سو بار چمن مہکا ، سو بار بہار آئی (صوفی تبسم)

کلامِ فیضؔ کا حوالہ دیتے ہوئے شان الحق حقی صاحب فرماتے ہیں کہ فیضؔ یہ کیفیت شعوری جور پر طاری نہیں کرتے تھے بلکہ شعوری طور پر تو وہ اس سے نکلنے کی کوشش کرتے تھے:

> ''اس کلام کی سب سے بڑی خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ یہ شعوری کاوش سے تعلق نہیں رکھتا۔ صریح آمد ہے جس کے آگے فیضؔ اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں، بلکہ میرا گمان ہے کہ وہ شعوری طور پر کچھ ایسے ٹکڑے ڈال دیتے ہیں کہ کلام بالکل روایتی بن کر نہ رہ جائے۔ اس میں کچھ نیا فکر اور نیا شعور بھی نظر آئے۔''۲۱

بے شمار ناقدین کی آراء کے مقابل فیضؔ نے وہی طرزِ عمل اختیار کیے رکھا جو مولانا حالیؔ نے اپنے ناقدین کے مقابلے میں اپنائے رکھا تھا۔ "پر ہم نے دم نہ مارا" کے مصداق فیضؔ نے ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا جس کا تجزیہ پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

فیضؔ کی غزلوں کی تعداد کُل ملا کر چوراسی (۸۴) ہے۔ اس قدر قلیل سرمائے کے ساتھ اُردو غزل کی تاریخ پر اس قدر گہرے نقوش چھوڑنا نہ صرف بڑے اعزاز کی بات ہے بلکہ یہ اس حقیقت کی نشان دہی بھی ہے کہ فیضؔ کی ہر غزل معیار کے میزان پر بھی پورا اُترتی ہے۔ فیضؔ کے چالیس سالہ طویل ادبی سفر کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ تعداد اور بھی کم یعنی دو غزلیں سالانہ نکلتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کس درجہ ذہنی ریاضت سے فیضؔ یہ سرمایہ منظرِ عام پر لائے ہوں گے۔ شعر فکری ریاضت ہے جو دل اور دماغ دونوں کی ہم آہنگی کا متقاضی ہے۔ کیوں کہ اس فن کے مادی وسائل (الفاظ) بھی انسان اپنے ہی وجود میں تلاش کرتا ہے لہٰذا اظہار اور معانی کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس پیچیدہ صورت میں شعر کی خوبصورتی کا تجزیہ، نگارش اور اظہار کے تجزیے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس امر کی وضاحت دیوانِ غالبؔ کے آخری شعر میں نہایت خوبی کے ساتھ ملتی ہے:

شعر کی فکر کو اسدؔ چاہیے ہے دل و دماغ! !
وائے کہ یہ فسردہ دل بے دل وبے دماغ ہے ۲۲

فیضؔ نے ہر حال میں مقصد کی افادیت کو مقدم رکھا ہے اور اپنی غزل کو عصرِ حاضر کا آئینہ بنا دیا جس میں ان کا سیاسی شعور نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ جس طرح غالبؔ کے خطوط ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بے نقاب کرنے میں معاون ہیں بالکل اسی طرح فیضؔ کی شاعری ہمارے سیاسی نظامِ حکومت کا اصل چہرہ عُریاں کرنے میں مدد گار ہے۔ فیضؔ کی خلاقی یہ ہے کہ وہ شعوری کوشش سے تمام لافانی جذبوں کو غزل کے قالب میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے۔ خارجی محرکات سے جنم لینے کے باوجود بھی فیضؔ کی غزل ہر دل کی دھڑکن ہے۔ فیضؔ کی آواز متوسط طبقے کی آواز ہے۔

سید عبد اللہ نے خواجہ میر دردؔ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ دردؔ کے بہترین اشعار وہ ہیں جہاں وہ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کو اس طرح ملا دیتے ہیں کہ ان کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گویا امتزاجی کیفیات ایک خوشگوار شاعرانہ تخلیق کی صورت میں جلوہ گر ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''مجاز و حقیقت کا یہ پیوند دراصل درد کے صوفیانہ ذہن کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت اور صوفیانہ فطرت ان کی غزل میں اس طرح ہم آہنگ ہوگئی ہے کہ اس سے ایک نہایت ہی کو شگوار امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔"۲۳

اس حوالے سے جب ہم فیضؔ کی شاعری کا ان شخصیت کے تناظر میں از سرِ نو تجزیہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ کی طبیعت میں رومان رچا بسا تھا۔ انقلاب ان کی فطرت میں تھا۔ فیضؔ کے بہترین اشعار وہ ہیں جن میں ان دونوں جذبوں کو آپس میں یوں ملا دیا گیا ہے کہ ہم ان کو الگ الگ نہیں کر سکتے:

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تیری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے ۲۴

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے ۲۵

حضورِ یار ہوئی دفتر جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے ۲۶

رومان اور انقلاب کی ملی جُلی کیفیت نے فیضؔ کے کلام کو انوکھی جلا بخشی ہے۔ وہ جس انداز میں اپنے انقلابی نعرے کو اپنے مخصوص رومانوی انداز میں گم کر دیتے ہیں اُس کی نظیر دیگر ترقی پسند شعراء کی شاعری میں نہیں ملتی۔ اسی انداز میں فیضؔ کی شاعرانہ عظمت کا راز پنہاں ہے۔ "زندان نامہ" کی غزلوں کے اشعار کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے غور طلب ہے:

"ان اشعار کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ فیضؔ غزل کی اساسِ صنعت اُن کا انقلابی نعرہ نہیں بل کہ وہ شاعرانہ لہجہ ہے جس سے وہ انقلابی نعرہ کو کیموفلاج کرتے ہیں۔" ۲۷

دوسری جانب واضح رہے کہ فیضؔ کسی بھی قیمت پر زندگی اور نظریے کو ایک دوسرے سے الگ دیکھنے کے خواہاں نہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق کوئی بھی مرحلۂ زیست نظریے کی نعمت سے خالی نہیں۔ زندگی ایک دشوار گزار راستہ ہے اور اس میں یقیناً دو چار بہت سخت مقام بھی آتے ہیں۔ ان میں مشکل ترین مرحلہ یہ ہے کہ جب فن اور زندگی باہم متصادم ہو جائیں۔ اس موقع پر عظیم فنکار جو راستہ اختیار کرتا ہے وہی قابلِ تقلید راستہ ہے۔ اس میں جدِ وجہد کی ایک ایسی صورت ہے جو ایک نیا مضمون پیدا کرتی ہے اور تخلیق کو نئی جلا بخشتی ہے۔ فیضؔ کے نزدیک زندگی کا مقصد خود زندگی سے نبرد آزما ہونا ہے، اس کے آگے ہتھیار ڈالنا نہیں۔ چنانچہ منٹو کی موت کے موقع پر ایلس فیضؔ کو اپنے ایک خط میں فیضؔ رقم طراز ہیں :

"بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کیوجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصہ ہے۔" ۲۸

اسی ضمن میں یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ فیضؔ کی غزل اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔۔ جب وہ معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ غم ان کا اجتماعی غم بن جاتا ہے۔ مگر فیضؔ نے مصلحت کے تقاضوں کو بھی محسوس کیا۔ ڈاکٹر محمد ارشد اویسی

اور میمونہ سبحانی اپنے مضمون ،فیض احمد فیضؔ اور علامتِ سَحر ' میں اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ تقاضلئے دردِ دل بر سرِ عام بیان کرنے سے متعلق دشواریوں پر بھی فیضؔ کی نظر مرکوز تھی :

" فیضؔ کے جرأتِ اظہار نے پر کٹھن مرحلے سے گزر کر عرض گزاری کی لیکن سماجی تضادات کے جبر کو اور اس کے حوالے سے مصلحت کے تقاضوں کو فیضؔ نے محسوس کیا۔ فیضؔ کی نیم تبسم کی کیفیات اور خیال میں بے نیازی ہر دور میں اپنی مثال آپ رہی۔ فیضؔ آشتراکی روایت کے احترام کو اپنی ذات کا حصہ بنا چکے تھے۔ چنانچہ ان کی جرأتِ اظہار نے تخلیقی عمل کا راستہ دریافت کرنے لگی۔ "۲۹

یہ فیضؔ ہی کا کرشمہ تھا کہ اُنھوں نے ترقی پسند تحریک میں جذباتیت کی لہر کو شدائد سے بچائے رکھا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔ ہم جانتے ہیں کہ ترقی پسندی ابتدا میں ایک نعرہ تھی مگر یہ فیضؔ کا ایک اعجاز تھا کہ اُس نے اسے اس سطح سے اُٹھا کر جمال کا پیرہن عطا کر دیا۔ فیضؔ نے اپنے اُسلوب میں اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھا کہ تمام علائم کو اُس انداز میں برتا جائے کہ وہ ایک مجموعی تاثر پیش کر سکیں۔ اسی سبب سے ان کی شاعری آفاقی رنگ اختیار کر گئی۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو اُن کی شاعری کو چونکا دینے والی شاعری نہیں بننے دیتا بلکہ غور و فکر کا سرچشمہ بنا دیتا ہے:

"فیضؔ کو دوسرے ترقی پسند شعرا سے ایک چیز بالکل الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہنگامی حالات کو بھی ہنگامی انداز سے پیش نہیں کرتے، وہ جوش اور جذبات کے بہاؤ میں بہہ کر شعر لکھنے کبھی نہیں بیٹھے لیکن یہ بھی نہیں کہ ان کے ذہن میں یہ ہنگامے، یہ حادثات یہ واقعات، یہ ظلم و ستم، یہ جبر و قہر، یہ تلخیاں اور محرومیاں نہیں ہوتیں۔ یہ سب کچھ ان کے لاشعور میں ہوتا ہے۔ ان کے اشعار کی اساس یہی چیزیں ہیں۔ ان تمام چیزوں کو وہ الگ الگ تصور نہیں کرتے۔ ان سب کے ملنے سے جو ایک جذبہ اُبھرتا ہے وہ ان کے اشعار کا خام مواد ہوتا ہے۔ فیضؔ اپنے مخصوص جذبے کے ساتھ غور و فکر کے میدان میں نکل آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض اشعار آفاقی حیثیت کے علمبردار ہیں۔"۳۰

فیضؔ اپنے دل نشیں اُسلوب کے باعث ہی بلند مقام پر کھڑا ہے اور لوگوں میں آج بھی زندہ ہے۔ فیضؔ کو قبولیتِ عام اور شہرتِ دوام کی جانب شستہ و رفتہ کرنے والا یہی وہ اُسلوب ہے جس میں خود سوزی اور دل نوازی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہ فراق کی بجائے وصل چاہتا ہے اور وصل ہی میں تنوع اور راحت تلاش کرتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ فیضؔ فلسفے کے نہیں زندگی کے شاعر ہیں۔ ان کا اُسلوب متوسط طبقے کے لوگوں کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ ان سے فیضؔ کی سرگوشی دراصل اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ وہ جس قسم کے انقلاب کے خواہاں تھے اس کا سرچشمہ یہی عوام ہیں۔ فیضؔ کا اُسلوب کلاسیکی روایات کا امین ہے مگر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ فیضؔ اپنے اُسلوب کے اعتبار سے میرؔ کی بجائے سوداؔ کے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ میرؔ کی

بجائے سوداؔ کے پرستار ہیں (واضح رہے کہ سوداؔ کی غزل خارجی محرکات سے متاثر تھی کیونکہ اِ نہیں بحیثیت شاعر سوداؔ کے کلام میں زیادہ تنوع نظر آتا ہے۔ان کی ایک تخلیق جو نظم کی بجائے غزل کے زیادہ قریب ہے بعنوان" نذرِ سوداؔ "بھی اسی پسندیدگی کی غمازی کرتی ہے:

قصۂ سازشِ اغیار کروں یا نہ کروں
شکوۂ یار طرحدار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لبِ ورخسار کروں یا نہ کروں۳۱

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ترقی پسند تحریک کا رُجحان نظم کی طرف رہا مگر فیضؔ نے ترقی پسند غزل کو فروغ دیا جو ایک کارہائے نمایاں ہے۔ حقیقی زندگی سے گہرا تعلق اوراس کی حقیقت نگاری کا جو درس فیضؔ نے دیا وہی ماکسزم اور ترقی پسند تحریک کا اصل جوہر قرار پایا ۔ان کے اُسلوبِ بیان میں بلا کا تحمل اور بردباری ہے۔ان کی غزل کے یہ اوصاف انہیں ایک تحریک سے وابستگی کے باوجود بھی صفِ اول کے شعراء کے مقابل لا کھڑا کرتے ہیں۔فیضؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے بے حد دھیمے انداز میں معاشرے میں اس قدر ارتاش پیدا کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مدِ مقابل معاشرہ نہیں بلکہ وہ قوتیں ہیں جو معاشرے کو پھلنے پھولنے نہیں دیتیں۔ہر چند کہ فیضؔ کی شاعری کو تند وتُرش تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا تاہم لاکھ حرف گیری کے باوجود بھی ان کا قد کم نہیں ہوا۔جدید خیالات اور موضوعات کو قلم بند کرنے والے فیضؔ نے روایت سے کٹ کر شاعری نہیں کی۔ تمام کلاسیکل شعراء کا اُسلوب ان کی شاعر میں گھل مل گیا ہے۔اس بنا پر ان کی غزل کو کلاسیکل غزل کا خلاصہ بھی کہا جاتا ہے۔فنی اعتبار سے فیضؔ کی غزل ریزہ خیالی اور فسانہ تراشی جیسے عیوب سے پاک ہے۔یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ فیضؔ کی غزل وہ جذبات لیے ہوئے ہے جو ایک عام انسان کے جذبات ہیں۔ایسا انسان جو کسی خاص مکتبِ فکر سے تعلق نہیں رکھتا۔فیضؔ کی غزل کا اُسلوب اس قدر متاثر کُن ہے کہ اس کی معنویت کو پانے کے لیے قاری کو کسی خارجی ثبوت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔فیضؔ کی غزل کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اِن کی غزل ایک ایسی نمائندہ غزل ہے جو صحت مند رجحانات کی مالک ہے۔رومان سے انقلاب تک کے سفر نے فیضؔ کی غزل کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ تمام ناقدین کی طرح عام قاری بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ فیضؔ کی غزل آئیندہ زمانوں میں بھی فیضؔ کو زندہ رکھے گی۔

حوالہ جات:

۱۔ معین الدین عقیل، پاکستانی غزل (اشاعت اوّل)، کراچی، المخزن پرنٹرز، ۱۹۹۷ء، ص۱۷
۲۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص۷
۳۔ عبادت بریلوی، اُردو تنقید میں نئے تجربے، تنقید اور اُصولِ تنقید، لاہور، ادارۂ ادب و تنقید، ۱۹۸۴ء، ص۹۷۔۹۸

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، کراچی، معارف پرنٹرز، ۱۹۷۰ء، ص ۶۶

۵۔ ایضاً ص ۶۵ ۶۔ ایضاً ص ۶۶

۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ولیؔ سے اقبالؔ، لاہور، جدید اُردو ٹائپ پریس، ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۰۔۱۲۱

۸۔ احتشام حسین، ادب اور تہذیب، مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر (ترتیب: قمر رئیس، عاشور کاظمی)، دہلی، ثمر آفسٹ پریس، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۱۔۲۰۲

۹۔ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اُردو ادب، کراچی، اکیڈیمک آفسٹ پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۳۸۹

۱۰۔ فیضؔ، دستِ صبا، مشمولہ، نسخہ ہائے وفا، لاہو، بخاری پرنٹنگ پریس، س ن، ص ۱۶۵

۱۱۔ فیضؔ، زندان نامہ، ایضاً ص ۲۶۶

۱۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج، لاہور، ندرت پریس، ۱۹۷۸ء، ص ۲۲۴

۱۳۔ فیضؔ، زندان نامہ، مشمولہ، نسخہ ہائے وفا، ص ۲۴۰

۱۴۔ انتظار حسین: ناصرؔ کاظمی، آخری گفتگو، مشمولہ ہجر کی رات کا ستارہ (مرتبہ احمد مشتاق، باصر سلطان کاظمی)، لاہو، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۴

۱۵۔ سید محمد عقیل رضوی، پَر مجھے گفتگو عوام سے ہے، مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص ۴۴۷

۱۶۔ شان الحق حقی، سرِ وادیٔ سینا کی غزلیں، مشمولہ فیضؔ فہمی، لاہور، دی ری کونر پبلی کیشن، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۰

۱۷۔ فیضؔ، دستِ صبا، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ص ۳۴۸

۱۸۔ شمس الرحمن فاروقی، فیضؔ اور کلاسیکی غزل مشمولہ فیض فہمی، ص ۱۴۷

۱۹۔ فیضؔ، دستِ تہِ سنگ، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ص ۳۶۶۔۳۶۷

۲۰۔ فیضؔ، سرِ وادیٔ سینا، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ص ۴۵۷

۲۱۔ شان الحق حقی، سرِ وادیٔ سینا کی غزلیں، مشمولہ فیضؔ فہمی، ص ۱۷۰

۲۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالب، کراچی، فضلی سنز (پرائیویٹ لمیٹڈ)، ۱۹۹۷ء، ص ۳۴۲

۲۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، درد کا صوفیانہ لب ولہجہ، مشمولہ ولی سے اقبال تک، ص ۱۲۷

۲۴۔ فیضؔ، زندان نامہ، مشمولہ، نسخہ ہائے وفا، ص ۲۴۰

۲۵۔ فیضؔ، دستِ تہِ سنگ، مشمولہ، نسخہ ہائے وفا، ص ۳۲۹

۲۶۔ فیضؔ، زندان نامہ، مشمولہ، نسخہ ہائے وفا، ص ۲۶۱

۲۷۔ سلیم احمد، معتدل گرمیِ گفتار غزل گو، مشمولہ فیضؔ فہمی، ص ۳۷۶

۲۸۔ عبداللہ ملک، فیضؔ کا فلسفۂ زیست اُس کے اپنے خطوط کی روشنی میں، مشمولہ ہالۂ (بیادِ فیضؔ) ص ۲۴۸

۲۹۔ محمد ارشد اویسی، میمونہ سبحانی، فیض احمد فیضؔ اور علامتِ سحر، بازیافت مرتبہ فخر الحق نوری، لاہور، شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء ص ۴۲

۳۰۔ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اُردو ادب، ص ۳۸۹

۳۱۔ فیضؔ، دستِ صبا، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ص ۱۴۱